کچھ بھولی بسری باتیں

مولانا فضل حق خیر آبادی:

علوم عربیہ دو بڑے شعبوں میں منقسم ہیں -(۱) علوم نقلیہ مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت و تاریخ وغیرہ (۲) فنون عقلیہ مثلاً منطق، فلسفہ، ھیئت، نجوم وریاضی وغیرہ- علماء اسلام میں سے کسی کو کسی علم میں شہرت حاصل ہوئی اور کسی کو کسی فن میں - علماء رامپور، فنون عقلیہ میں بڑے متبحر تھے-(۱) مذکور الصدر بزرگ ایک ایسے ہی علمی خاندان کے مایۂ ناز فرزند ہیں - ان کے والد ماجد مولانا فضل لمام خیر آبادی اپنے وقت کے ایک جلیل القدر عالم اور کئی کتابوں کے مصنف ہونے کے علاوہ حکومتی دوائر میں بھی بڑی قدر و منزلت کے مالک تھے- مغل دور میں صدر الصدور ایک نہایت عالی منصب تھا- مولانا فضل امام دہلی میں اس منصب پر فائز تھے-

مولانا فضل حق نے عقلیات اپنے والد سے پڑھے- حدیث میں حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی (جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے صاحبزادے اور حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے چھوٹے بھائی تھے- ترجمہ قرآن پاک اور تفسیر موضح القرآن ان کا ایک زندہ جاوید کارنامہ ہے) سے شرف تلمذ حاصل کیا-لڑکپن ہی میں تحصیل علوم سے فراغت حاصل کرلی- مولانا فضل حق کے بعد ان کے خاندان میں بھی علم کی شمع روشن رہی-

شاہ اسمٰعیل شہید اور مولانا فضل حق کا تعلق:

مولانا فضل حق نہایت ہی ذہین اور فطین آدمی تھے- عقلیات میں مہارت کی وجہ سے طبیعت علمی مجادلات کی طرف بہت مائل تھی- حضرت شاہ اسمٰعیل بھی ایک بلند پایہ عالم اور خاندان ولی اللّٰہی کے ایک نامور سپوت تھے-(۲) مولانا فضل حق ان سے مناظرہ کے لئے میدان میں اتر آئے- بعض ایسے مسائل ان میں زیر بحث رہے- جن کے عنوان بھی شاید اس زمانہ کے فارغ التحصیل مولوی صاحبان نے نہیں سنے ہوں گے- اس کے باوجود مولانا فضل حق کے مزاج میں انصاف پسندی بہت زیادہ تھی- حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نقل فرماتے ہیں کہ:

حاشیہ (۱) بعض اکابر سے ایک واقعہ سننے میں آیا- جو قارئین کے فائدہ کے لئے یہاں نقل کیا جاتا ہے- قصہ یوں ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا جلسۂ دستار بندی ہورہا تھا- اکابر علماء سٹیج پر تشریف فرما تھے- حضرت شیخ الہند کا بیان ہورہا تھا- اس اثناء میں سامنے علماء رامپور پنڈال میں داخل ہوئے- حضرت شیخ الہند بیٹھ گئے- علماء نے استدعا کی کہ بیان جاری رکھا جائے- مگر حضرت نہ اٹھے- مولانا حافظ محمد احمد صاحب دارالعلوم کے مہتمم ہونے کے علاوہ بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانا توی کے صاحبزادے تھے- انہوں نے صاحبزادگی کی حجت کرتے ہوئے اصرار کیا- حضرت شیخ الہند نے فرمایا- پہلے تو میں ازراہ اخلاص بیان کررہا تھا- اتفاقاً بیان نے معقولی رنگ اختیار کیا- میری نگاہ علماء رام پور پر پڑی- تو میرے دل میں خیال آیا کہ آج رام پور والوں کو معلوم ہوگا کہ دیوبند والے بھی معقولات خوب جانتے ہیں- اب اخلاص نہیں رہا- اس لئے میں بیان سے معذرت خواہ ہوں-

(۲)- شاہ اسمٰعیل شہید حضرت شاہ عبدالعزیز کے حقیقی بھتیجے اور شاہ اسحٰق دہلوی آپ کے نواسے ہیں- اول الذکر نے میدان کارزار کو سنبھالا- اور حضرت شاہ اسحٰق نے ایک عرصے تک مدرسہ رحیمیہ دہلی کی چار دیواری کو قال اللہ اور قال الرسول کی صداؤں سے گرمائے رکھا- حضرت شاہ عبدالعزیز اپنے قابل فخر بھتیجے اور مایۂ ناز نواسے کے بارے میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا مقولہ تلاوت فرمایا کرتے تھے- الحمدللہ الذی وہب لی علی الکبر اسمٰعیل واسحٰق- اللہ کا شکر ہے کہ جس نے بڑھاپے میں مجھے اسمٰعیل اور اسحٰق عطا فرمادیئے ہیں-

ایک مرتبہ مولانا فضل حق سے کسی نے شاہ اسمٰعیل کے بارے میں دریافت کیا تو مولانا نے جواب دیا کہ ان کے حریف کی برتری کے لئے یہی بات کافی ہے کہ اس نے ان سے ٹکر لی۔ پھر حضرت شاہ اسحٰق کے بارے میں پوچھا گیا تو جواب دیا میاں اب تو انسانوں کا ذکر ہو رہا ہے فرشتوں کا ذکر ہو تو ان کے بارے میں پوچھنا۔

سیاسی ابتری اور مولانا فضل حق:

دربار دہلی کا اجڑنا مولانا نے بچشم خود دیکھا تھا۔ یکے بعد دیگرے انگریزی عملداری کا پھیلتے چلے جانا بھی وہ مشاہدہ فرما رہے تھے۔ بالخصوص مسٹر ڈلہوزی کے جاری کردہ قانون الحاق کے بعد ہندوستانی ریاستوں پر انگریزوں کا قابض ہوجانا بھی انہوں نے ملاحظہ فرمایا۔ ایک حساس اور غیرت مند انسان کے لئے یہ تمام واقعات صبر آزما تھے۔ مولانا ان حالات کو دیکھ کر انتہائی کرب اور بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے دہلی کو خیرباد کہہ دیا۔ وہاں سے نواب فیض احمد خان والی جھجر کے پاس چلے گئے۔ وہاں سے الور، ٹونک، رام پور وغیرہ ریاستوں میں زندگی کے کچھ دن گزار کر لکھنؤ چلے گئے۔ جہاں انہیں صدالصدور کا منصب سونپا گیا۔ ذاتی اور خاندانی وجاہت اور علمی قابلیت کی وجہ سے مولانا جہاں بھی جاتے۔ ان کی بڑی پذیرائی ہوتی۔ دہلی کو چھوڑنے کا عزم کرلیا تو مغل بادشاہ نے انہیں آبدیدہ ہو کر الوداع کہا تھا۔ لکھنؤ کی فضا مولانا نے دہلی سے بھی زیادہ مکدر دیکھی۔ واجد علی شاہ رنگ رلیوں میں سرشار تھا اسے نہ تو اسلام دشمن تحریکوں سے کوئی سروکار تھا نہ زوال حکومت کا کوئی اندیشہ۔ ۱۸۵۶ء میں اسے معزول ہونا پڑا۔

مولانا کی مجاہدانہ سرگرمیاں:

لکھنؤ ہی میں مولانا کی ملاقات، حضرت مولانا شاہ احمد اللہ مدراسی سے ہوئی۔ اس ملاقات نے ان کی کایا ہی پلٹ دی۔ وسط ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کے جذبات، آتش فشاں بن کر پھٹ پڑے۔ مولانا فضل حق دہلی پہنچے۔ بہادر شاہ ظفر سے ملاقات ہوئی۔ اندازہ لگایا کہ اس کی بڑھی ہڈیوں میں مغز ندارد۔ بادشاہ پست ہمتی اور کوتاہ اندیشی کا شکار تھا۔ کمپنی کی حکومت اعلان کر چکی تھی کہ بہادر شاہ کے کسی جانشین کو شاہ نہیں کہا جائیگا۔ نہ اسے وظیفہ ملے گا۔ بایں حال یہ تھا کہ

حمیعت نام ہے جس کا، گئی تیمور کے گھر سے

شہزادے باہمی رقابت اور چشمک میں مبتلا تھے۔ انہیں نہ تو ملک کی کوئی فکر تھی نہ دین کی۔ جنرل بخت خاں جو روہیلوں کی سپاہ لے کر یہاں آیا ہوا تھا۔ وہ البتہ ایک مخلص اور دوراندیش انسان تھا۔ اس سے مولانا کی ملاقات ہوئی تو اس کے اندھیروں میں آس کی کوئی کرن نظر آئی۔ وہ کب تک ضبط سے کام لیتے۔ آخر کار ایک جمعہ کے روز انہوں نے جامع مسجد میں جہاد کے موضوع پر تقریر کی اور علماء کا تصدیق شدہ ایک فتویٰ عوام کو سنایا۔ اس تقریر اور فتویٰ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ باغیانہ سرگرمیوں نے باقاعدہ جہاد کی شکل اختیار کرلی، مگر وائے ناکامی، مسلمانان ہند کی شب تاریک کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا۔ شہزادوں کی حماقت اور عاقبت نااندیشی حصول مقصد میں حائل ہوئی اور کمپنی کی افواج نے پھر غلبہ حاصل کرلیا۔

جہاد آزادی ۱۸۵۷ء میں ناکامی کے نتائج:

مغل شہزادوں کی باہمی آویزش، مجاہدین میں بدنظمی اور ہم آہنگی کے فقدان اور مخالفین کی غدارانہ سازشوں کے نتیجہ میں تحریک حریت ناکام رہی۔ اب انگریزوں نے مجاہدین سے دل کھول کر بدلے لئے اور ایسی ایسی

شرمناک اور حیا سوز کارروائیاں کیں جن کے بیان سے انسانیت شرماتی ہے اور نوک قلم پر لرزہ طاری ہوجاتا ہے۔ چند ایک جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ بہادر شاہ ظفر کو اس کے سمدھی مرزا الٰہی بخش نے انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار کرادیا۔ بالآخر اس پر مقدمہ چلا اور اس کو بڑھاپے کی عمر جیل خانہ (رنگون) کی سلاخوں میں گزارنی پڑی۔ ملکہ کو بھی ان کے ساتھ جیل جانا پڑا۔

۲۔ بہادر شاہ کے بیٹوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ ان کے سر کاٹ کر انگریز افسر میجر ہڈسن نے مرزا مغل کی کھوپڑی میں اس کا خون پیا اور شہزادوں کے سر ایک خوانچہ میں رکھ کر بطور تحفہ بادشاہ کو پیش کیے۔ ان شہزادوں میں مرزا مغل بھی شامل تھے۔

۳۔ شاہی خاندان کے انتیس جوانوں کو گولیوں، توپ یا پھانسیوں کے ذریعے قتل کیا گیا۔

۴۔ جہاد حریت کی ابتداء میرٹھ سے ہوئی تھی۔ جبکہ فوجی سپاہیوں نے سور کی چربی والے کارتوسوں کو دانتوں سے کھولنے سے انکار کردیا تھا۔ اس کا بدلہ یوں لیا گیا کہ مجاہدین کو سور کی کھالوں میں سلوا کر تیل کے کھولتے ہوئے کڑھاؤ میں ڈلوادیا جاتا۔

۵۔ دہلی کا شہر کئی روز قتل عام کے سلسلہ میں گولیوں کی گھن گرج سے بوچڑخانہ بنا رہا۔ گلی کوچے خون کی ندیوں میں تبدیل ہوگئے۔ کم و بیش ستائیس ہزار انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ فتح پوری مسجد سے قلعہ کے دروازے تک ہر درخت پھانسی گھر بنا ہوا تھا۔ مسلمانوں کی لاشیں کئی کئی روز تک لٹکتی رہتیں تاکہ ناظرین عبرت حاصل کریں۔

۶۔ سکھ رجمنٹ کے سپاہیوں سے برسر عام مجاہدین کے ساتھ اعلام کا لعنتی کام کرایا گیا۔

۷۔ مساجد کی بے حرمتی ہوئی۔ شاہجہاں کی بنوائی ہوئی جامع مسجد کے ہال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں نے دفتر قائم کرلیے۔ اس کے حجروں میں گھوڑے باندھے گئے۔ وضو کے حوض میں گھوڑوں کی لد وغیرہ ڈالی جاتی تھی۔

۸۔ علماء حق خاص طور پر ہدف انتقام بنے۔ ان پر مقدمات چلائے گئے۔ بیسیوں جید علماء کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔ انہیں کالے پانی میں حبس دوام کی سزا دی گئی۔

علامہ فضل حق پر مقدمہ بغاوت:

آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت علامہ کی مسجد کی تقریر اور فتویٰ نے مہیز کا کام دیا۔ جنگ ختم ہوئی تو انگریزوں نے آپ پر بغاوت کا مقدمہ چلایا۔ آپ دلی پر انگریزی تسلط دوبارہ قائم ہوجانے کے بعد پانچ دن تک بھوکے پیاسے ایک مکان میں بند رہے۔ ایک شب کی تاریکی میں اہل و عیال سمیت نکل کر چھپتے چھپاتے اپنے شہر میں پہنچ گئے۔

کارروائی مقدمہ کے سلسلے میں آپ ماخوذ ہو کر لکھنؤ پہنچے۔ مقدمہ کی کارروائی شروع ہوئی تو شہادتیں پیش ہوئیں۔ سرکاری وکیل نے بحث کی۔ مولانا نے تمام مدافعت خود ہی کی۔ مولانا زبردست مناظر تھے۔ اس لئے نہ گواہوں کو چلنے دیا۔ نہ سرکاری وکیل کو جمنے دیا۔ ادھر جج بھی دل سے مولانا کا ہمدرد تھا۔ جب مولانا دہلی میں صدرالصدور تھے۔ وہ مولانا سے کام سیکھتا رہا تھا۔ کچھ تو مولانا کی وجاہت کا اثر، کچھ مولانا کی قابلیت کا رعب، استغاثہ کا اصل گواہ، جس نے مولانا کی تقریر اور فتویٰ کی تحریری کی تھی۔ مکر گیا۔ اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ تقریر کرنے والے صاحب یہ نہیں ہیں، ادھر سرکاری وکیل لاجواب ہوگیا۔ اب یقین ہوگیا کہ مولانا بری ہوجائیں گے۔ اسیروں نے تو کہہ دیا کہ مولانا بے قصور ہیں اتنے میں مولانا کی آواز پھر گونجی، آپ نے فرمایا

"اب میں تمام ذمہ داری قبول کرتا ہوں اور اعتراف کرتا ہوں کہ تقریر میں نے ہی کی تھی۔ فتویٰ میں نے ہی لکھا تھا۔ مخبر نے صحیح رپورٹ کی تھی۔ اب یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ یا میری شکل سے مرعوب ہو گیا ہے۔ مجھے اللہ کے پیش ہونا ہے۔ میں جھوٹ بول کر اپنی عاقبت خراب نہیں کرنا چاہتا۔ ہر چہ بادا باد۔"

جج خود پریشان ہو گیا۔ اس نے اشاروں کنایوں میں مولانا کو ٹوکا بھی کہ مولانا آپ کدھر بہے جا رہے ہیں۔ لیکن اب کیا ہوتا بادل ناخواستہ جج نے حبسِ دوام بعبور دریائے شور، کا فیصلہ دے دیا۔ مولانا نے بڑی خندہ پیشانی سے فیصلہ کو خوش آمدید کہا۔

مولانا کا قید میں وفات پانا:

فیصلہ کے بعد مولانا کو جزیرہ انڈمان بھیج دیا گیا۔ مولانا کا علم و فضل اور ذاتی وجاہت، دوسری طرف وہ مشقت جو ان کے ذمہ لگائی گئی۔ حضرت علامہ کو جیل میں Sweeper (خاکروب) کی ڈیوٹی دی گئی۔ مقصد سے لگن نے کیسے کیسے دن دکھائے.....ع

آسماں راحق بود گر خوں ببارد برزمیں

جیل خانہ کا سپرنٹنڈنٹ ایک لکھا پڑھا شریف الطبع انگریز تھا۔ اس نے نجوم اور ہیئت الافلاک کے موضوع پر ایک کتاب بزبان فارسی لکھی۔ اس کا تعارف ایک اور قیدی مولوی صاحب سے پہلے سے تھا۔ اس نے اپنی وہ کتاب ان مولوی صاحب کو دکھائی۔ مولوی صاحب نے وہ کتاب علامہ فضل حق کو دکھائی۔ حضرت علامہ نے کتاب کو دیکھ کر ضروری حک و اصلاح فرمادی۔ مولوی صاحب نے وہ کتاب لے جا کر مصنف کو دی تو وہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مولوی صاحب نے اسے حقیقت حال بتائی کہ یہ حواشی حضرت علامہ فضل حق کے ہیں جو بغاوت کے مقدمہ میں سزا یافتہ ہو کر یہاں آئے ہوئے ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ جیل متاثر ہو کر مولانا کی زیارت کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ حضرت علامہ ٹوکری لیے ہوئے اپنی ڈیوٹی انجام دیتے پھر رہے ہیں۔ تو سپرنٹنڈنٹ کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ وہ معذرت خواہ ہوا اور اس نے یہ ڈیوٹی ختم کر دی۔

مولانا کے صاحب زادگان مولانا عبدالحق اور مولانا شمس الحق خود بھی بڑے عالم فاضل تھے۔ انہوں نے پریوی کونسل (لندن) میں فیصلہ کے خلاف اپیل دائر کی۔ بعد از سعی بسیار وہاں سے رہائی کا پروانہ آ گیا۔ صاحبزادے پروانہ لے کر انڈمان پہنچے جیل کے قریب تھے کہ جیل سے ہزاروں سوگواروں کے ساتھ ایک جنازہ باہر آ رہا تھا۔ دریافت کرنے پر بتایا گیا کہ علامہ فضل حق خیر آبادی کا جنازہ ہے۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

مولانا رضی اللہ بدایونی:

بدایوں اب کیسا ہے؟ یہ تو معلوم نہیں ہے۔ البتہ ماضی میں بدایون کا شہر علماء اور دانشوروں کا گڑھ رہا ہے۔ مذکور الصدر بزرگ، نہ صرف یہ کہ ایک علمی خاندان کے رکن تھے۔ بلکہ اپنے علم و فضل کی رو سے بھی فرد فرید تھے۔ بہت سے انگریز بھی آپ سے عربی، فارسی زبان کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ان میں ایک مسٹر کارمیکل تھے۔

۱۸۵۷ء کے معرکہ میں مولانا نے بدایوں کے محاذ پر کارہائے نمایاں انجام دیے۔ جب حالات دگرگوں ہوئے تو مولانا بھی گرفتار ہو گئے۔ اتفاق کی بات مسٹر کارمیکل کلکٹر تعینات تھا جس کے سامنے مولانا کا مقدمہ پیش ہوا۔